

## آخر میں ہی کیوں؟

قاسم فردوس دیوار پر آویزاں داراشکوہ کے قطعے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ نہ جانے وہ سوچ کی کن کن منزلوں میں تھا۔ قاسم نے کوئی ہزارویں مرتبہ پڑھا

یک ذرہ ندیدیم زخورشید جدا

ہر قطرہ آب ہست عین دریا

حق را بچہ نام کس بتواند خواندن؟

ہر نام کہ ہست است از اسمائے خدا.....

کچھ سال پہلے وہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں داراشکوہ کی جمع کردہ تصویروں کے اہم سے متعارف ہوا تھا۔ تب اس کے دل میں داراشکوہ کے لیے عجیب قسم کے جذبات نے جنم لیا۔ ہمیشہ سے وہ مغلیہ بادشاہوں کے متعلق دور رخ رویے کا شکار رہا۔ جب کبھی وہ ان کے متعلق سوچتا اس کے دل میں محبت اور نفرت کا دوہرا چکر چلنے لگتا..... ہر بادشاہ ہی قابل ستائش اور ساتھ ہی نفرت کا حقدار تھا۔ داراشکوہ کی شخصیت پر اگر صوفی کا اطلاق ہوتا تھا تو ساتھ ساتھ بادشاہت کے لیے نبرد آزما ہونے کا چارج بھی تھا بھلا کسی صوفی کا بادشاہ سے کیا سروکار؟ کوئی صوفی ملکیت کا دعویٰ دار کب ہوا تھا؟..... قاسم فردوس کو شیکسپیر کے کرداروں کی طرح داراشکوہ ایسے نظر آتا جن کی اپنی ذات کی خنجر نے انہیں قتل کر دیا۔ داراشکوہ کی خوبیاں ایک ایسے بھاری پتھر کی طرح تھیں جس کے بوجھ تلے کیڑے پلتے تھے۔ خوبیوں کا پتھر سرکتا تو بادشاہت کی طبع کے لال بیک پتھر سے فرار ہو کر باہر پھرنے لگتے..... کیا واقعی منصور حلاج کی سوچ

داراشکوہ میں حلول کر گئی تھی؟ کیا وہ مرتد تھا؟ بادشاہت کی طبع غم و غصہ کی آگ میں بدل گئی تھی اور اس کے سفر کا رخ موڑ دیا تھا؟ وہ مغل بادشاہوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ان بادشاہوں کے اندر کا رخ کدھر تھا؟ حسن پرست آرٹسٹ نے سیاست میں کبھی پیدا کی یا پھر کاروبار سلطنت نے ان فن کاروں پر عرصہ حیات تنگ کیا؟ کیا آبائی وطن سے دوری نے مغل شہزادوں کو ایسا منقسم کیا کہ وہ کبھی بھی ایک جائی اختیار نہ کر سکے؟..... بکھرے ہوئے شہزادوں میں داراشکوہ سب سے زیادہ ذات کی خنجر سے خودکشی کرنے والا تھا۔ اسے اورنگ زیب سے کم اور اپنے وجود سے زیادہ تکلیف پہنچی..... وہ ایک ذات میں کئی روپ اکٹھا کر کے الگ الگ سب کی پرورش کرتا رہا۔

قاسم فردوس نے پرگنہ باڑی میں بسنے والے اس صوفی کے متعلق لمحہ بھر کو سوچا جس سے داراشکوہ کو والہانہ محبت تھی اپنا نام یہ کہہ کر نہ بتاتا تھا کہ ہر نام خدا کے ناموں میں سے ہے تو پھر اپنے نام سے کیا شناخت پیدا ہوگی؟ جب بانی کا ہر قطرہ سمندر ہے تو پھر کسی کا نام کیا معنی رکھتا ہے؟ چند لمحے دیوار پر لٹکے قطعے کو دیکھنے کے بعد قاسم فردوس دیوار کا قرب کو چھوڑ کر کمپیوٹر کے آگے جا بیٹھا۔ کیا داراشکوہ واقعی مرتد تھا۔ یا پھر خاص لوگوں کی بات عام لوگوں کے روبرو کرنے سے یہ نتائج مرتب ہوئے؟ اصل میں داراشکوہ کون تھا؟

بھاری پتھر یا پتھر کے نیچے دبا ہوا جان بچانے والا کیڑا؟ یا پھر دونوں مصلوب بھی اور معتبوب بھی۔

قاسم فردوس کمپیوٹر کے سامنے اپنی بیٹی کو ای میل دینے کی غرض سے بیٹھا تھا۔ لیکن فی الحال وہ خالی الذہن ہونے کی کوشش میں تھا۔ ایسی باتیں سوچتے ہوئے اسے گھٹنے گزر جاتے اور کبھی کبھی وہ ایک ہی کرسی یا صوفے میں دھنسا سا رادن گزار لیتا۔ اسے اپنا آپ بھلانے میں کافی دیر لگ جاتی۔ وہ بلاوجہ ماضی کی یادداشتوں میں الجھ کر پرانے زخم ادھیڑنے، سہلانے اور کریدنے میں وقت گزارا کرتا۔ کئی یادداشتیں اس کے پاس پرانے خطوں کی طرح محفوظ تھیں۔ اپنے اور پرانے لوگوں کے عطا کردہ دکھ، الزام، بے عزتی اور بدنامی سے معائنہ کرنے پر وہ مجبور تھا۔ دبے پاؤں یہ یادیں اس پر حملہ آور ہوتیں اور وہ ان سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکتا۔ رفتہ رفتہ قاسم کی یہ عادت ثانیہ

میں کٹ جاتا ہے۔ تم مجھے فراغت سے بیٹھ لینے دیا کرو۔ لیکن تمہاری اونٹنی کھوپڑی میں یہ بات ہی نہیں آتی۔“

مودب وزیر اور بھی با ادب ہو گیا۔ ”جی صاحب۔“

”مجھے امریکہ ای میل بھیجنا تھی وزیر۔ یہ صاحب چندہ مانگیں گے اور کیا؟“ خاناماں نے ہمت پا کر کہا۔ ”نہیں سر وہ کہتے ہیں کہ انہیں آپ سے کوئی کام نہیں بلکہ وہ آپ کے کسی کام آنا چاہتے ہیں۔“

قاسم فردوس اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میرے کون سے کام آئیں گے؟ میرے کام لوگوں کے بس کے نہیں ہیں۔ پھر بھی تھوڑا سا تجسس اس کے دل میں ابجرا۔“

”میں نے پوچھا تھا سر کہ آپ کو کیا کام ہے تو وہ کہنے لگے ”ہم کام کرنے والے ہیں کروانے والے نہیں تم بلا تکلف ملاؤ۔۔۔۔۔۔“

”اچھا بھٹاؤ۔“

”بٹھا دیا ہے سرجی۔ بڑے خوبصورت ہیں۔ پاؤں تو اتنے گورے ہیں کیا کسی کشمیرن کا منہ ہو گا۔ فرشتے سے لگتے ہیں۔“

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔۔ چلو میں آتا ہوں۔“

”کہنے لگے میں پتہ کر کے آیا ہوں وہ گھر پر ہیں اگر نہ بھی ملنا چاہیں تو بھی ملا دینا ان کے فائدے کی بات ہے۔“ وزیر نے بات بڑھائی۔

”چلو میں آتا ہوں۔“

قاسم فردوس اتوار کے دن بڑا ڈھیلا ڈھالا رہنے کا شوقین تھا۔ ہر مودانیکر، امریکی سویٹ شرٹ اور ہوائی چپلوں میں وقت گزارنا اس کی عیاشی تھا۔ ٹائی، بلٹ، بوٹ سے رہائی پا کر اسے عجیب قسم کی مسرت ملتی۔ ملاقاتی اس لیے پسند نہ تھے کہ اتوار کے دن وہ کسی قسم کا نارمل لباس پہننا ہی پسند نہ کرتا تھا۔ جلدی جلدی شلوار قمیص پہن کر اس نے حلیہ تبدیل کیا۔ اسے نئے مہمان سے ملنے کا تھوڑا سا اشتیاق پیدا ہو ہی گیا تھا۔

سورج راس الجدی میں پہنچ چکا تھا۔ سچے چل رہے تھے لیکن کچھ دیر ہوا میں بیٹھنے کے بعد پٹکھاند کرنے کو جی چاہتا۔ باہر کی ہوا ٹھنڈی تھی۔ لیکن کمروں میں گرمی کا احساس ہوتا۔ جینز پر کلیوں والا کرتا پہنے راعی صفت درمیانی عمر کا ایک آدمی صوفے پر

بن گئی تھی۔ ادھر وہ فراغت پاتا ادھر دل و دماغ یادداشتوں کا ضمیمہ لے کر حاضر ہو جاتے۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے اور دل میں ملال کی کیفیت ابھر آتی۔ وہ اپنی نشست پر کھسکتا کھسکتا نڈھال نیم دراز ہو جاتا اور کھلی آنکھوں کسی پرانے وقت، گم شدہ شخصیت جیسے موسم کا زنجیر پا ہو کر مرنے کی آرزو کرتا۔ ایک ہی خیال اس کے دل میں چکر لگانے لگتا۔ آخر میں ہی کیوں؟ اللہ نے مجھ مظلوم پر کیوں اتنے عتاب نازل کیے۔ میں ہی کیوں ہمیشہ ہدف بنا؟ ایسے میں اس کے دل سے ان گنت کلمہ کفر نکلتے۔ وہ اس ایٹو رنڈا سے نڈھال ہو کر یہاں تک سوچتا کہ خدا کبھی انسان تو رہا نہیں۔ وہ کب سوچ سکتا ہے کہ بندے پر ایک چھوٹی سی زندگی میں کیا کچھ گزر جاتی ہے۔ پر آگندہ خیال قاسم فردوس یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ قطرہ سمندر سے جدا تو ہے نہیں؟ پھر کہیں انسانوں کے دکھ اس کے دکھ تو نہیں؟..... کیا انسان کے دکھ معکوس راستے سے رب کے حضور تو اکٹھے نہیں ہو رہے؟ شیطان کو مدت معین عطا کرنے کی وجہ سے اللہ بھی درمیان میں پڑنے سے معذور تھا؟ رشتہ کی صاحب نے ایک مرتبہ اسے کہا تھا۔ بھائی تم تشکیک کے شکار ہو لیکن تشکیک ایمان کا حصہ ہے۔ جو کوئی خدا کو مانے گا وہی کبھی تشکیک میں مبتلا ہو گا ناں؟ اصلی گناہ تو دہریہ ہونا ہے سو وہ تم ہو نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ پھر فکر کیسی ہر راستے سے واپس بھی تولو نا جا سکتا ہے؟

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔۔۔۔۔۔“

بڑا ہی مودب خاناماں وزیر سامنے کھڑا تھا۔

”سر آپ سے کوئی صاحب ملے آئے ہیں۔“

”کون؟“

”نام نہیں بتایا سر۔ پہلے کارڈ دے رہے تھے پر اسے بھی جیب میں واپس منول

دیا۔“

قاسم فردوس کو جھڑکنا نہ آتا تھا۔ کئی بار چھوٹی غلطی پر زیادہ پھنکار اور کئی مرتبہ بڑے قصور پر مکمل معافی مل جاتی تھی۔ قصور بھر سرزنش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

”یار تمہیں کئی بار کہا ہے کہ اتوار کی اکلوتی چھٹی ہوتی ہے۔ سارا ہفتہ بینک

”کس اخبار سے مسلک ہیں؟ کسی نیوز ایجنسی سے۔“

”کسی اخبار سے بھی نہیں.....“ مہمان زیر لب مسکرایا۔

قاسم فردوس نے دل میں سوچا کہ اس شخص کا تعلق کسی اخبار سے نہیں بلکہ شاید یہ اسامہ بن لادن کا ایجنٹ ہے، یوسف رمزی سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ اس کے پاس کچھ ایسے راز ہیں جو وہ قاسم کے توسط سے کہیں پہنچانا چاہتا ہے اور اسی لیے وہ اپنی شناخت ظاہر کرنے میں متاثر ہے۔

قاسم فردوس نے فیصلہ کیا کہ جب تک وہ خود اپنا نام پتہ ظاہر نہ کرے گا وہ بھی آئیل مجھے مار جیسے اصرار کے ساتھ تفتیش میں نہ پڑے گا۔ مہمان کچھ ایسی حکمت عملی تدبیر اور ڈھنگ سے بیٹھا تھا کہ قاسم کو شبہ گزرا وہ کسی سفارت خانے کا مندوب ہے اور کسی اہم معاملے میں سراغ پانے کے لیے آیا بیٹھا ہے۔ قاسم بوک کہن سال کی طرح ٹٹول ٹٹول کر باتیں کرنے لگا۔ دیر تک وہ عراق، لیبیا، فلسطین، ملائیشیا اور دوسرے مسلمان ممالک کے متعلق تھوڑی سی شد بد کی مدد سے باتیں کرتا رہا۔ ایسے مسلم ممالک جو آزاد تھے لیکن پالیسی کے اعتبار سے مجبور بھی تھے اور نفاذ بھی تھوڑی دیر کے بعد جب مہمان کی چپ اہانت آمیز ہو گئی تو قاسم فردوس نے اہل تدبیر کی طرح کافی دیر تک بات ایسی مسلم تحریکوں کے متعلق کی جو سر پر کفن باندھ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے پھر اچانک سوال بن کر مہمان کی خاموشی کو توڑا۔

”آپ کا کیا خیال ہے یہ..... شہید لوگ کیا ہوتے ہیں؟“

مہمان گویا پینک سے جاگا۔

”میں زیادہ تو نہیں جانتا اور نہ ہی قطعیت سے بات کر سکتا ہوں لیکن یہ لوگ تبدیلی کے کارپرداز ہوا کرتے ہیں۔ ایسی تبدیلی جو اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتی اللہ کی رضا کے لیے لائی جاتی ہے..... غام لوگوں کی ڈکٹنری میں یہ اونٹنی کھوپڑی کے لوگ ہیں۔ لیکن اصل میں انہیں اپنے لیے کچھ درکار نہیں ہوتا..... بس یہ تبدیلی کے مہرے ہیں۔ ان کے حالات مخدوش ہوں اور ان کا عمل بیم ناک ہو۔ لیکن ان کا ایمان کبھی ڈانواؤں میں نہیں ہوتا..... اپنے لیے خفتہ اور اللہ کے لیے بیدار رہتے ہیں.....“

قاسم فردوس کو یقین ہو گیا کہ مہمان کا تعلق ضرور طالبان سے ہو گا یا پھر وہ فلسطین، کشمیر، بوسنیا، الجزائر یا کسی بنیاد پرست مسلم تحریک کا پیٹھی ہو گا.....

بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ سفید، بال سیاہ، چہرہ روسی، ہاتھ ایرانی اور نشست کا انداز امریکن تھا۔ پاؤں واقعی کسی کشمیرن کے چہرے سے بھی گورے تھے۔

قاسم فردوس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا ”قاسم فردوس.....“ ”جی..... جی..... السلام علیکم.....“

”بیٹھے.....“ قاسم نووارد سے اس کا نام نہ پوچھ سکا۔

”چائے پیئیں گے کہ ٹھنڈا؟“

”جی کچھ نہیں۔ میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ دراصل میں مشروبات

نہیں پیتا..... نہ ٹھنڈا نہ گرم۔“

”سگریٹ؟“

”جی نہیں شکریہ..... عادت نہیں پڑی۔“

قاسم نے ازراہ میزبانی پہلے تو بدلتے موسم کے متعلق بات چیت شروع کی۔ کچھ دیر کے بعد قاسم چپ ہو گیا اسے لگا مہمان سن ہی نہیں رہا۔ پھر سیاست کی جانب رجوع کیا۔ یہ گفتگو بھی بے سود ثابت ہوئی کہ نووارد نہ محظوظ ہوا نہ دل برداشتہ ہو کر کسی جوش کا اظہار کیا بس مسکراتا رہا۔ کچھ دیر وہ پاکستان کے مختلف علاقوں کی زبانوں اور کلچروں کے متعلق اپنی علمیت بگھارتا رہا لیکن دوسری جانب سے گرجوئی سے شمولیت نہ ہوئی۔ پھر گفتگو میں تھوڑے تھوڑے خاموشی کے وقفے آنے لگے۔

”آپ..... کہاں رہتے ہیں؟“

”رہنا کہاں ہے کبھی افغانستان، کبھی سوڈان، لیبیا..... عراق کبھی صومالیہ۔“

”اچھا اچھا۔“

قاسم نے دل میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ شخص دہشت گرد ہے اور کسی طرح اس سے کوئی بڑا فائدہ نہ قابل حصول مراعات مانگنے آیا ہے..... یا پھر اسلحہ کو غیر قانونی طور پر کہیں پہنچانے کی ڈیمانڈ ہو؟

”کیا آپ جرنلسٹ ہیں؟ جگہ جگہ گھوم پھر کر انفارمیشن جمع کرتے ہیں؟“ ٹھہر ٹھہر کر قاسم نے سوال کیا۔ کھلے بندوں وہ مہمان کو دہشت گرد بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا؟

”کچھ کچھ..... کسی حد تک۔“

”آپ..... کسی اسلامی تحریک کے رکن ہیں؟“ قاسم نے سوال کیا۔  
”حکم نہیں.....“

اتنے مختصر سے جواب نے قاسم فردوس کو گڑبڑا دیا۔ کس کا حکم؟  
کون سا حکم؟ حکم دینے والا کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ خانہ زاد کی سی آواز  
نکال کر قاسم نے پوچھا۔ ”کس کا حکم.....“  
”میرا اپنا اور کس کا؟“

”جی..... جی..... بالکل اپنے سے زیادہ کس کا حکم پابند کر سکتا ہے۔“ خوشامدی  
لہجے میں قاسم بولا۔

لمبی ہوسی چپ سارے میں پھیل گئی۔ اس دوران قاسم نے اپنے اندر ٹٹولا۔  
اب مہمان سے کیا بات کی جائے؟ وہ دونوں ماتم داروں کی طرح سر جھکائے بیٹھے  
رہے۔ مہمان کا رعب حسن اس درجہ خائف کرنے والا تھا کہ قاسم اب بات کرتے  
بھی ڈرتا تھا کہ کہیں مہمان کو ناگوار ہی نہ گزرے۔

قاسم شہر کا بہت بلند اقبال ٹینکر تھا۔ شہر کے امیر ترین، بیدار بخت دو بھاشیے  
اس کے سامنے بکری بن کر بیٹھے رہتے۔ گورنمنٹ کی فنانس پالیسیاں اس کی اعانت کے  
بغیر بن نہ سکتی تھیں، وہ حکومت کے معاشی منصوبوں کو سبوتاژ کرنے کی چوکی میں  
تھا لیکن اس سرپاپندار کے آگے اس کے الفاظ کم پڑ رہے تھے۔ وہ اپنی ناقدری اور کم  
علی پر افسردہ سا تھا۔ کیا یہ اپنی بلیک منی میرے بینک کے حوالے کرنا چاہتا ہے اور اپنے  
پیسے کو لانڈر کرنے کی غرض سے وارد ہوا ہے؟

کیا اسے کثیر رقم کی ضرورت ہے؟ اور بغیر قابل اعتماد سفارش اور سیوری کے  
خود اپنا منیبن بن کر آیا ہے؟

کہیں غیر قانونی اسلحہ درآمد کرنے کا تو مسئلہ نہیں؟ کسی شکی ماں پارٹی نے  
اسے بلیک میل کرنے کے لیے بھیجا ہو؟

ہو سکتا ہے کہ سرے سے صاحب مال نہ ہو فقط قرض حسنہ مانگنے آیا ہو؟  
نبی نظریں کیے قاسم نووارد کی ٹوہ لینے پر تڑا ہوا تھا۔ بڑی سے بڑی میننگ  
میں جہاں صاحب تخت موجود ہوتے قاسم کبھی نروس نہ ہوا۔ اس کی پالیسی تھی کہ تمام  
ممبروں کی گیس آؤٹ کرنے کے بعد بات کرتا اور ذی جاہ لوگوں کو آخر میں

Lasod ڈال کر ہنکالے جاتا۔ آخری رائے ہمیشہ اسی کی ہوتی اور معتبر ٹھہرتی لیکن  
آج وہ اپنے سے بھی بڑے صاحب فن کے سامنے رنکھسا بیٹھا تھا۔

بڑی دیر کے بعد خوش طالع نے زبان کھولی ”آپ فرینکفرٹ سے نیویارک  
جاتے ہوئے ایک شخص سے ملے تھے؟“

نہ جانے وہ کتنی بار یہ سفر کر چکا تھا؟ کسی مخصوص شخص اور سفر کا ذکر ہو رہا تھا  
”شاید آپ کو بھول گیا ہو لیکن رشدی صاحب نے مجھے بہ اصرار کہا تھا کہ میں آپ سے  
ضرور ملوں، وہ آپ کے لیے بہت ہی متوفش تھے.....“

”مجھے کچھ یاد نہیں..... کون سے رشدی صاحب؟“  
”لمبا سا قد ہے، فراخ ماتھے پر نمازیوں کی محراب ہے۔ بڑی دھیمی آواز میں  
بات کرتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں ہمہ وقت۔“

قاسم کے ذہن میں کوئی رشدی نہ ابھرا۔ نہ فراخ ماتھا نہ محراب۔  
”آپ دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ وہ کھڑکی کی جانب تھے  
اور آپ گلی کی طرف۔“

یہ کون سی پہچان تھی بھلا؟ وہ تو ایک عرصہ سے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا  
تھا۔

”شاید آپ کو یاد ہو وہ رامش ٹیکسٹائل کے مالک ہیں۔“  
فوراً قاسم کو رشدی یاد آگیا۔ اس کی طرح وہ بھی پچاس سے اوپر تھا۔ چھوٹی  
چھوٹی کچھڑی پکی داڑھی۔ کندھے خیدہ، تھوڑی سی نکلی ہوئی ٹوند، ہاتھوں میں نرت کی  
سی کیفیت اور چہرے پر عورتوں کی سی ملائمت۔

لمبے سفر کے دوران رشدی نے اپنے رویے سے قاسم کو مکمل طور پر گود لے  
لیا۔ وہ دونوں سالوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے، کافی پینے کے  
دوران وہ مسلسل باتیں کرتے رہے۔ رشدی نے تو اپنی رام کہانی مختصر سی سنائی کہ وہ  
کیسے فیکٹری کا مالک بن گیا۔ قدم قدم پر وہ اپنی جدوجہد کو اللہ کے فضل، اس کی رحمت اور  
کرم سے منسوب کرتا رہا، مشکلات کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اور خوش قسمتی کا  
کریڈٹ اللہ میاں کو دیتا رہا۔

قاسم نے سفر کے دوران رشدی کے سامنے اپنے اندر کے پھپھولے



پھوڑے تھے۔ ”رشدی ابھی میں تین برس کا تھا کہ والد فوت ہو گئے۔۔۔۔۔ ماں زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی پھر بھی ہمت والی تھی۔ اس نے سکول میں بچوں کو پڑھا کر ہمیں تعلیم دلوائی۔ جس روز میں آٹھویں میں وظیفہ لے کر گھر آیا بھائی کی لاش سامنے دھری تھی۔۔۔۔۔ جس روز کالج میں داخلہ ملا ساتھ ہی بہن اغوا ہو گئی۔ کئی برس اسے ڈھونڈنے میں لگے۔ جب وہ گھر آئی تو گونگی تھی۔ پھر کبھی کسی سے بات نہ کی۔ ماں اور میں غریبی سے چور حالات کے آگے بے بس بڑھتے چلے گئے۔ دوسرے بھائی پر چوری کا مقدمہ چلا۔ پانچ سال جیل میں گزارے اس دوران میں نے تعلیم مکمل کی۔ بینک میں ملازم ہو گیا۔ شادی کی۔۔۔۔۔ کئی اوگٹ گھائیوں سے نکلا۔ میری ماں کینسر سے روٹی چلائی مری۔ گونگی بہن کو طلاق ہو گئی۔۔۔۔۔ اور جب میں سارے غم کے دریا پار کر کے دوسرے کنارے پہنچا تو اکلوتی بیٹی نے تبدیل مذہب کر لیا اور ایک امریکن سے شادی کر لی۔ بیوی نے سلپنگ پلر کھالیں۔۔۔۔۔ اب کبھی کبھی زاہدہ بیٹی سے ملنے امریکہ جاتا ہوں تو بیوی یاد آتی ہے ورنہ میں نے اپنی کونھی میں جھاڑو پھیر کر تعلقات کو کوڑے کرکٹ کی طرح باہر نکال پھینکا ہے۔“

”آپ کو رشدی صاحب یاد آگئے؟“

”جی بالکل اچھی طرح سے۔۔۔۔۔ عجب آدمی تھے۔ ان کی زندگی بھی کچھ آسان نہ گزری تھی لیکن نہ وہ شاک تھے نہ گلہ گزار۔ مجھے بھی بڑی نصیحتیں کرتے رہے لیکن مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر اتنی مشقت ایسی صبر آزما مصیبتیں صرف میرے لیے ہی کیوں؟ میں ہی اللہ کا ہدف کیوں ہوں۔ اللہ میاں اس قدر بے انصاف کیوں ہے؟۔۔۔۔۔ کیا وہ دیکھ نہیں سکتا کہ کافی ہو چکی؟ آپ مجھے اس طرح نہ دیکھیں میں اس زندگی میں جہنم پر رضامند نہیں ہو سکتا۔ رشدی صاحب کی آرزو تھی کہ میں اللہ میاں کے خلاف منہ سے کچھ نہ کہوں لیکن میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔“

ہانڈی کے نیچے آگ جلائیں گے تو گیس نکلے گی۔۔۔۔۔ میں سچا آدمی ہوں۔ جو کچھ میرے دل میں ہے میں اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ کچھ لوگوں پر انتہا کا نامہ بیان ہے اور کچھ کو ایسے ہی بلا وجہ نواز دیتا ہے۔ یہ بے انصافی ہے سراسر۔۔۔۔۔ کچھ ساری عمر قلاش بے بضاعت تہی دست رہتے ہیں۔ اور کچھ کے پیچھے دولت آندھی بن کر لگ جاتی ہے۔ کچھ اولاد کو ترستے مر جاتے ہیں اور کچھ بچوں کا ریوڑ ہانکتے پھرتے ہیں۔

یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کچھ لوگوں کو وہ ساری عمر کیوں پیتا ہے ہمیں انصاف کا حکم دے کر خود بے انصافی کیوں؟ سمجھ نہیں آتی کہ اس کے پیچھے کیا منطق ہے؟“

مہمان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ شعاعوں کی طرح پھیل گئی۔

”کیا کبھی آپ کو اللہ میاں پر ترس نہیں آیا؟ اپنی تخلیق کو آزمائش سے گزارنا کچھ آسان ہے؟“

قاسم فردوس اچنبھے میں پڑ گیا۔

”کیا آپ کو کبھی خیال آیا کہ ابھی وہ بھی ایک معین مدت تک ایک چیلنج کے حوالے سے اپنی مرضی سے کن کہہ کر آدم کے لیے جنت نہیں بنا سکتا۔۔۔۔۔ جنت سے نکالتے وقت ایلیس کے ساتھ یہی طے ہوا تھا۔ ہے نا۔۔۔۔۔ ایک معین مدت تک۔۔۔۔۔“

”میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“

مہمان نے مسکرا کر سارے کمرے کو اجال دیا۔

”بات بڑی معمولی ہے آپ رشدی صاحب سے ہی سمجھ لیتے تو بہتر تھا۔“

”کون سی بات۔۔۔۔۔“

”آپ اللہ کو بے انصاف سمجھ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں پر مہربان۔۔۔۔۔ کچھ پر نامہربان ہونے کا الزام لگا رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے تھوڑی سی اجازت دیں تو میں رشدی صاحب کے حالات آپ پر ظاہر کروں۔“

قاسم فردوس نے بادل خواست اثبات میں سر ہلا دیا۔

”رشدی صاحب کا ایک اور بھائی بھی تھا۔ توام بھائی تھے۔ دونوں جب جوان ہوئے تو والد کی طرف سے بڑی جائیداد ملی۔ کوٹھیاں، دکانیں، مربیعے۔۔۔۔۔ بینک بیلنس۔۔۔۔۔ ماں زندہ تھی دونوں کو بے حد انصاف کے ساتھ گویا پانی پانی کا حساب کر کے باپ کا ترکہ دے دیا۔۔۔۔۔ اب ان دونوں کی علیحدہ زندگیاں شروع ہوئیں۔ بھائی راحت نے اپنی دولت سے دوست، محبوبائیں، رشتہ دار راضی کیے۔ راگ رنگ، دلکشی خوشی تکبر کا سودا کیا۔۔۔۔۔ رشدی نے جائیداد کو بڑھایا۔ لوگوں کی مدد کی۔۔۔۔۔ لاوارث خوشیوں سے اجتناب کیا، ذمہ داری کی زندگی بسر کی۔ رشدی کی زندگی میں قہقہے کم آئے آنسو کی روانی زیادہ رہی۔۔۔۔۔ جڑواں بھائی راحت پر بھی خدا مہربان رہا کہ ساری عمر عیش میں گزری۔ رشدی پر بھی نامہربان نہ ہوا۔۔۔۔۔ کہ عمر بھر اللہ یاد رہا۔۔۔۔۔ جب کبھی اللہ بھولنے

لگتا کوئی مصیبت نازل ہو کر اوپر والے کی یاد دلادیتی۔ ادھر آسائشوں کا نرغہ گھیرے میں لیتا ادھر رشدی پر کوئی آفت آجاتی..... پلٹ کے پرانے دوست کا ہاتھ پکڑ لیتا..... حتیٰ کہ دولت ثروت مدح و ذم حب جاہ سب طاقتیں بے اثر ہو گئیں۔ اللہ کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے اسباب کی ضرورت نہ رہی۔ دھن دولت رشتے ناطے سب سب فانی اسباب بے اثر..... دنیا ساتھ تو رہی..... لیکن ہم نہ بنی۔“

”لیکن اللہ حساب سے تکلیف دے ناں سب کو بانٹ کر..... برابر برابر۔“  
”مشکل یہ ہے قاسم فردوس جی..... سونیو..... پیاریو..... اللہ تو کسی کو بھی تکلیف دے کر راضی نہ سمجھی ہوا تھا نہ ہوگا..... اس نے تو بابا آدم کو جنت دی تھی جس کی کسی شاخ پر کاٹنا نہ تھا۔ پر بابا آدمی نے اپنا اختیار آزمایا..... ابلیس نے اس کے کانوں میں جو سحر پھونکا اس نافرمانی کے تحت آج انسان دنیا میں ہے اور جذبات سے مغلوب ہو جانے پر مجبور..... صاحب اختیار ہے اپنے راستے خود چن سکتا ہے۔ اللہ بھی ایک معین وقت تک پابند ہے کہ ابلیس کو مہلت دے اب حق و باطل کی جنگ میں اللہ میاں کھیل کے اصول تو ذکر کیسے انسان کے لیے یہاں پر جنت تعمیر کر دے؟“  
”جیسے کچھ لوگوں کے لیے دوزخ ہر لمحہ دکھتا ہے کچھ کے لیے کھلی جنت..... وہ تو ایک کن سے..... سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر سکتا ہے؟“

”اللہ ایک معین وقت تک مہلت دینے کا اقرار کر چکا ہے۔ انسان کو صاحب اختیار بنا چکا ہے۔ میں بار بار کہہ رہا ہوں..... جنت سے بابا آدم اپنے فیصلے سے نکلے؟“  
”یہ سب باتیں ہیں فرضی..... تاویلیں جواز ہیں بے معنی۔“

”اللہ کی ساری مخلوق نے جو وزن اٹھانے سے انکار کیا تھا وہ وزن کیا تھا قاسم جی؟..... وہ وزن تھا جذبات کی مغلوبیت..... انسان پر کوئی مصیبت آہی نہیں سکتی اگر وہ جذبات کے ہاتھوں اس درجہ دباؤ میں چلا نہ جائے اگر جذبات پر قابو ہو تو کیا غریبی کیا امیری کیا دوست؟ کیا دشمن؟ کون سا رشتہ ناطہ کار گر ہو سکتا ہے؟..... سنو قاسم پکھل دستو کے راجہ شد و دھن کے گھر مہما تم بدھ پیدا ہوا..... راجہ نے تمام دنیا کی آسائشیں بدھ کے قدموں میں ارن پین کیں۔ لیکن ایک رات مہما تم بدھ سولہ سوراٹیاں، یثودھرا اور اپنا بچہ پوری جنت چھوڑ کر جنگلوں میں چلا گیا..... اللہ نے اس سے نہ نکل چھڑائے نہ رشتے ناطے۔ اپنی مرضی سے سدھا رتھ نے جذبات کا جوا اتار پھینکا اور پرندوں کی

طرح آزاد ہو گیا.....“

”یہ ساری باتیں فرینکفرٹ سے شکاگو جاتے ہوئے مجھ سے کی تھیں.....“  
”رشدی نے..... اور بے کار تھیں۔ لفظوں سے دل کے زخم نہیں بھرتے۔ ہمیں شطرنج کے مہرے بنایا گیا ہے۔ ہماری چالیں مقرر ہیں۔ ہم بساط زندگی پر مجبور و نیکس چلتے ہیں یہ بے انصافی ہے۔“ مہمان نے اپنے پاؤں آگے پھیلا دیے۔ ہوائی چپل میں اس کے پیر اور بھی سڈول اور خوبصورت دکھائی دیے۔

وہ پھر مسکرایا۔ سارے میں کر نہیں ہی جھللائیں۔

”ہم تو جنت کے باسی تھے..... ہمیں تو اللہ نے سوئی بھر دکھ بھی نہ دینا چاہا تھا۔ پھر اپنی مرضی سے بابا آدم خود صاحب اختیار ہوئے۔ اپنی مرضی سے انہوں نے جنت اور دوزخ کو چننا چاہا..... پسند اور ناپسند کو اپنا و طیرہ بنایا..... اپنی پسند سے وہ بوجھ اٹھایا جس کو چرند پرند نباتات جمادات جن فرشتے اللہ کی ساری کائنات نے اٹھانے سے انکار کیا تھا۔“

”بتائیے بتائیے رکیے اور بتائیے۔ میری مرضی سے ماں کو کینسر ہوا۔ میری بہن میری رضا سے گونگی ہوئی؟..... میری بیوی نے مجھ سے پوچھ کر خودکشی کی۔ بھائی پر چوری کا الزام میری وجہ سے تھا۔ بیٹی کو میں نے مرتد ہونے کا مشورہ دیا۔ بتائیے یہ سب کچھ میرے مشورے سے ہوا؟ ان میں کون سا فیصلہ میرا تھا؟“

مہمان نے لمبا سانس لیا اور دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”دکھ کی بھی بڑی اقسام ہیں۔ آپ میری منطق ماننے کو تیار نہیں۔ میں نے کہاناں کہ اللہ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے وہ دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ آپ پر یہ بات بے اثر ہوئی۔ میں نے یہ بھی کہنا چاہا کہ دکھ کی بجھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بخوشی سرزد سے ہونے لگتے ہیں۔“

کبھی کبھی غم آدمی کو اس قدر پرانگندہ کرتا ہے اتنی کڑواہٹ اس میں پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جرائم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ معاشرے کے لیے اور خود اپنے لیے عذاب کا باعث ہو جاتا ہے۔ اسے سوائے بدلے کے اور کچھ نہیں سو جھتا۔ قاسم چڑ کر بولا۔

رشدی صاحب کی طرح لیکن جس نے اسے سزا جانا اللہ کی طرف سے اور اپنے آپ کو معتب اور بے قصور جانا وہ رہا ہو کر بھی قیدی کی طرح احساس جرم کی زنجیر سے بندھا رہا۔۔۔۔۔

”میں آپ کی بات نہیں مانتا۔“  
”کیسے؟“

”چلئے آپ فی الحال یہ سمجھ نہیں سکتے کہ غم کی کھالی آپ کی روح کے لیے کیا کر رہی ہے آپ کی شخصیت، روح، عاقبت کے لیے یہ کس قدر با معنی ہے چلئے نہ سہی لیکن ایک بات کا مجھے دکھ ہے اس لیے آپ پر ترس آ رہا ہے۔“  
”دکھ وہ کس بات کا؟“

”دکھ ہوتا ہے۔ ہو۔۔۔۔۔ آپ کے اندر سلایا رہے۔۔۔۔۔ آپ اس موقع کو نہ گنوائیں اور صابریں اور شاکرین میں سے ہو جائیں۔ گلہ نہ کریں کسی سے۔۔۔۔۔ اپنے غم کو اپنے تک محدود رکھ کر کوئی رد عمل نہ پیدا ہونے دیں تو آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کہاں پہنچ جائیں گے۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے۔۔۔۔۔ اس پر صابریں شاکرین چڑھ سکتے ہیں آزمائیجئے۔“ قاسم نے غصے سے کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ انسان کو کم سمجھتے ہیں۔ کالج کا برتن گرے تو کرچی کرچی ہو گا۔۔۔۔۔ چوٹ لگے تو درد یعنی ہے۔۔۔۔۔ ناکامی پر غصہ آئے گا۔۔۔۔۔ رشتے ناٹے ٹوٹیں گے تو غم ہو گا۔۔۔۔۔ آپ طبعی نیچرل باتوں کو کس احمق پن سے رد کر رہے ہیں سر، اصلی دکھ ہو تو کون چپ رہ سکتا ہے۔

”اصلی دکھ ہی تو کم ہونا سکھاتا ہے۔۔۔۔۔ پانی کو نشیب کی طرف جانے سے روک کر بجلی گھر بنانے کا نسخہ بتا رہا ہوں۔ کشش ثقل کے ساتھ گرنے کی بجائے ہوائی جہاز کی طرح اوپر اٹھنے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔ Gravity کی بجائے Deviation کی بات کر رہا ہوں۔ روح کو جسم کا پابند کرنے کی بجائے آزادی کا نسخہ بیان کر رہا ہوں۔ میں تو فقط اتنی عرض کر رہا ہوں کہ غم ہو۔۔۔۔۔ غصہ آتا رہے۔۔۔۔۔ لیکن اس کا اظہار نہ ہو، برداشت کرنے والوں کی طرح اندر ہی اندر سفر بدل جائے۔۔۔۔۔ پھر مسبب کچھ اور اسباب پیدا کر دے گا پہلے سے بھی بہتر۔۔۔۔۔ جب آپ غم کو بے معنی، لا تعلق ہو کر کرب کو جذب کرنے کا فن سیکھ لیں گے۔ جذبات سے مغلوب ہونے کی

”بینکر صاحب جس روز پہلے دن انسان نے اللہ کے حکم سے سرکوبی اختیار کی اور خود صاحب رائے ہوا اسی روز وہ اپنی مرضی سے غم آشنا ہوا۔ اس لمحے اس میں دو راستے معین اور مقرر ہوئے اب کیا کیا جائے اختیار تو اس کا ہے وہ دونوں راہوں کو یکجا کر سکتا ہے۔ خوشی کی حالت میں، خوف خدا سے، راستہ ایک رہتا ہے غم میں خدا کا ناشکرانہ رہ کر ایک ہی راستہ چن سکتا ہے لیکن کچھ خوشی یا غم دونوں حالتوں میں اپنے اندر دو راستے بنائے رکھتے ہیں۔ کبھی یکجا نہیں ہوتے۔“

”رشدی صاحب بھی آپ کی طرح بڑے دلائل پیش کرتے تھے۔ لیکن نہ وہ میرا غم کم کر سکتے ہیں نہ ہی میری ناشکر گزاری ان کے دلائل سے متاثر ہوئی؟“ بینکر نے جواب دیا۔

”قاسم صاحب۔ بات اتنی سی ہے کبھی آپ نے ہیرے کی قسمت پر غور کیا؟ نکالا جاتا ہے، تراشا جاتا ہے، انگوٹھی میں سجنے سے پہلے کئی مختلف تکلیف دہ مراحل سے گزرتا ہے۔ مٹی میں بھی پھاوڑا نہ چلے تو فصل اگ نہیں سکتی۔ مہندی توڑی، پیسی گوندھی نہ جائے تو رنگ نہیں لاتی۔ پھر اعلیٰ قسم کی روحوں کو تربیت نہ ملے۔۔۔۔۔ تو وہ ارفع و اعلیٰ کیسے ہوں؟ بلندی اور سر بلندی کے لیے گیند کو زمین پر پٹکنا پڑتا ہے ناں۔۔۔۔۔ خوشی میں تربیت نہیں ہوتی میرے آقا اس میں جسم عیش کرتا ہے روح کی راحت اور بالیدگی کے لیے تو آنا سو بہت ضروری ہیں۔“ قاسم غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔  
”اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہو تو آپ بتا سکتے ہیں مجھے کل سفر پر جانا ہے اور ابھی میں نے پیکنگ نہیں کی۔“

وہ بھی یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں بھی رشدی صاحب کے حکم پر آیا تھا مجھے ذاتی طور پر صرف ایک کام تھا۔“

”جی فرمائیے۔“

”میں آپ کی توجہ آپ ہی کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ زندگی کا سب سے سنہری موقع گنوا رہے ہیں۔ اڑنے کی بجائے دلدل کا رخ کر رہے ہیں۔ جس شخص نے برے دنوں کو اپنا امتحان سمجھا وہ ہمیشہ پاس ہوا۔

عادت چھوڑ دیں گے تو یہی دکھ آپ کی کشتی بن جائے گا..... دور بین کا کام دے گا۔ یہی دکھ کشتی بھی ہو گا ملاح بھی..... آپ آزما کر تو دیکھیں..... اس بوجھ کو تو ہم نے اپنی مرضی سے اٹھانے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس رحیم و کریم نے تو ہمارے دعویٰ کو بھی نعت کی سنہری زنجیر سے باندھ دیا ہے..... ہر وہ شخص جو دکھ میں اپنے آپ کو جذبات کے ہاتھوں مغلوب نہیں ہونے دیتا اس کے لیے تو دکھوں میں بھی جنت کی پروا چلنے لگتی ہے۔“

قاسم فردوس مہمان سے مصافحہ کر کے اندر کی جانب چل دیا۔ مہمان نے چندے توقف کیا پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا..... قاسم کمرے میں پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے فون اٹھایا دوسری جانب سے نسوانی آواز ابھری۔

”ہیلو.....“

”ہیلو.....“

”کون بول رہا ہے جی.....“

”آپ کا نام؟“

دوسری جانب ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا پھر آواز آئی ”میں ہوں آرزو۔“

قاسم فردوس ٹھوڑا سا گڑبڑا کر بولا۔ ”کون آرزو؟“

”میں آرزو۔“

”کیا میں کبھی آپ سے ملا ہوں۔“

”نہیں ایک مدت سے آپ نے مجھے نہیں دیکھا۔ بچپن میں ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے یاد ہے آپ کے پاس تتلیوں کو پکڑنے کا ایک ریکٹ نما جال تھا..... آپ اس میں تتلیاں پکڑا کرتے تھے.....“

”ہاں کچھ کچھ یاد آیا.....“ قاسم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”پھر آپ اس میں روشنی کی کرنیں بھی قید کرنا چاہتے تھے؟ یاد ہے۔“

اس بات کے متعلق وہ کچھ وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے اقرار

کر لیا۔

”آپ کو یاد ہے ایک بار آپ نے کہا تھا آرزو میں تمہیں اس میں پکڑنا چاہتا

ہوں، تتلیوں والے جال میں.....“

”شاید میں نے کہا تھا۔ شاید.....“

”اور میں نے کہا تھا آپ کا جال ناقص ہے..... اس کے دھاگے تو ذرا سا بھی بوجھ برداشت نہیں کر سکتے مجھے کیا پکڑیں گے۔“

”ہاں شاید میں نے کہا تھا..... کہ میں بہت صبر والا ہوں..... تمہیں پکڑ کر رہوں گا۔“

دوسری جانب ایک لمبا قہقہہ بلند ہوا۔ کسی ماڈل یا ایکٹریس کا قہقہہ۔ پھر فون بند ہو گیا۔ قاسم فردوس غراہت کا شکار گوگلوں کے عالم میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے متعلق شک و شبہ کا شکار تھا شاید یہ وقفہ بہت لمبا ہو جاتا۔ اس کی فیکس سے کاغذ نکلنے لگا۔ ابھی وہ آگے بڑھ کر پیام لینے والا تھا کہ مودب وزیر خان ساں نظریں جھکائے آکھڑا ہوا۔

”کیا بات ہے؟“

”سر کھانا لگا دوں؟“

”کچھ بھوک نہیں ہے آدھے گھنٹہ بعد سہی.....“

”اچھا سر.....“

”وہ صاحب جو آئے تھے چلے گئے؟“

”جی سر..... بڑے مذاقیہ آدمی تھے سر.....“

”تم نے کیسے اندازہ لگایا وزیر۔“

”وہ جی کھڑے کافی دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ جانے لگے تو میں نے

پوچھا آپ کا نام کیا ہے سر، کہنے لگے اللہ میاں۔ یاد رہے گا۔“

”اللہ میاں یہ کیا نام ہوا۔“

”میں نے بھی کہا تھا سر یہ کیا نام ہوا تو کہنے لگے یہی تو ایک نام باقی سب کو

بھلا دے ہیں۔“

قاسم فردوس کو پرگنہ باڑی کا فقرہ یاد آ گیا جو اپنا نام نہ بتاتا تھا۔

”میں نے بتایا ناں سر بڑا مذاقیہ آدمی تھا..... اگر آپ کھانا کھالیں سر تو بڑی

مہربانی ہوگی، آج میاں میر صاحب کا عرس ہے مجھے جانا تھا وہاں ذرا۔“

”اچھا لگاؤ۔“ فیکس سارا کاغذ اگل کر خاموش ہوئی۔ قاسم نے اٹھ کر فیکس

میں سے کاغذ نکالا۔ فارسی میں اشعار درج تھے پھر



یک ذرہ ندیم ز خورشید جدا  
ہر قطرہ آب ہست عین دریا  
حق را بچہ نام بتواند خواندن  
ہر نام کہ ہست است از اسمائے خدا

میں تجھے توحید کے بارے میں بتاتا ہوں اگر تو اسے اشارے سے سمجھ جائے  
خدا کے سوا کبھی کوئی معبود نہیں رہا ہے جن کو تو دیکھتا اور غیر جانتا ہے اپنی ذات میں وہ  
ایک ہیں اور نام سے جدا جدا ہیں۔

قاسم فردوس کو یوں لگا جیسے یہ فیکس اسے دارا شکوہ نے دی ہو۔ اس نے سر  
جھٹک کر سوچا کہ کیا روحیں فیکس دے سکتی ہیں۔ پھر خیال آیا کہ فیکس بھی تو کچھ کم  
حیرت کی بات نہیں ہزاروں میل کا فاصلہ پل بھر میں طے کرتی ہے۔ اگر سائنس ایک  
معجزہ کر سکتی ہے تو کون جانے روحیں بھی ایک معجزے پر اختیار رکھتی ہوں؟

قاسم نے سوچا ان مغل شہزادوں کے بارے میں کیا رائے قائم کروں؟ کیا  
انہماکی غم سے گزرنے والا آخر میں بھی دورا ہے پر کھڑا ہوتا ہے؟ وہ بھی صاحب اختیار  
ہونے کے ناطہ آخر کو اپنی پسند اور ناپسند کے تابع رہتا ہے کچھ لوگ پکارتے رہتے ہیں  
میں ہی ہدف کیوں بنا؟ مجھ پر ہی یہ پتا کیوں آئی؟ گلہ گزاریوں کی پوٹ بنے ایسے لوگ  
دہریے بن جاتے ہیں اور کچھ کو اس کی رحمت کا راستہ مل جاتا ہے۔ اطمینان سے بھری  
روح اپنے رب کی رضا میں راضی ہو جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ غم کی کھٹالی سے نکل کر  
ہر انسان کو ایک سا جواب ملے۔ چار بچوں کو اپنے ہاتھوں دفن کرنے کے بعد رشدی  
صاحب نے کبھی Why me نہ پوچھا۔

قاسم فردوس نے سر جھکا کر سوچا۔ آخر زندگی انسان سے چاہتی کیا  
ہے؟ مسرت کے طالب، غم آشنا دو راستوں پر چلنے والے؟ جذبات سے مغلوب  
انسان کا اصلی مقصد کیا ہے؟..... وہ یہاں وہاں کیوں بھٹکتا پھرتا ہے؟

قاسم فردوس نے تاسف سے پوچھا۔ کاش میں ان بڑے میاں سے انسان کی  
معنویت یا بے مقصدیت کے بارے میں پوچھ لیتا۔ یقیناً پرگنہ باڑی کے اس فقیر کو جواب  
معلوم تھا۔